PalArch's Journal of Archaeology of Egypt / Egyptology

RELIGIOUS TOLERANCE IN THE NOVELS OF QURAT-UL-AIN HAIDER (A POST-COLONIAL STUDY)

Dr. Humaira Usman[1], *Dr. Samia Ahsan*[2],

[1]Principal, Govt. College for Women Kallurkot, Bhakkar, Punjab, Pakistan

[2]Assistant Professor, Minhaj University, Lahore, Punjab, Pakistan

Dr. Humaira Usman, Dr. Samia Ahsan Religious Tolerance In The Novels Of Qurat-Ul-Ain Haider) A Post-Colonial Study). Religious Tolerance In The Novels Of Qurat-Ul-Ain Haider) A Post-Colonial Study)-- Palarch's Journal Of Archaeology Of Egypt/Egyptology 20(2), 1781-1792. ISSN 1567-214x

KEYWORDS: Colonialism, Religious Tolerance, Religious Sectarianism, Cultural Harmony, Respect For Each Other, Sufis, Monks, Yogis, Guru.

ABSTRACT

In the colonial system, religious sectarianism is used as a tool to achieve the colonial objectives. The British settlers adopted this strategy in the subcontinent as well as in their other settlements. Before the arrival of the British, Indian society was the cradle of religious tolerance. The British sowed the seeds of hatred on linguistic and religious grounds; even the inhabitants of India were not tolerant of one another. If we study the novels of QaratulAin Haider, the spirit of the real society of the subcontinent is seen breathing in these novels. She recovers the original society of the subcontinent in her writings. In her novels, there is the land of Indo Pak, where the Bhagati movement was born. Buddhist monks, Hindu yogis and sage Guru Nanak chanted slogans of peace and harmony and Muslim Sufis spread the message of peace and love. A subcontinent is a model of religious and cultural harmony, where the people of every religion are free to practice their religion and everyone respected each other's religion.

نو آبادیاتی نظام میں مذہبی فرقہ واریت کو بہ طور آلہء کار استعمال کر کے نو آبادیاتی مقاصد کی تکمیل کی جاتی ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو مقامی باشندوں کو ایک جسدِ واحد سے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کردیتی ہے اور یونآباد کار کے لئے لکڑیوں کے گٹھے کی بجائے ایک ایک لکڑی کو توڑنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے گروہ اجتماعی مفاد کو پس پشت ڈالکرانفرادی فائدے کی ہڈی چوسنے میں مصروف ہو جاتے ہیں ۔ بر صغیر میں پہلے پہل پرتگالیوں نے نوآبادیاتی نظام قائم کرنے کی کوشش کی ۔ پرتگالیوں کے ایک گورنر البو کریک کو دیگر مشوروں کے ساتھ ساتھ پرتگال کے بادشاہ نے فرقہ وارانہ حکمت عملی اپنانے کا بھی مشورہ دیا ۔(۱)

سلطنت برطانیہ کے نہ غروب ہونے والے سورج کی شعاعوں کا سنہرا پن اُس کی نو آبادیوں کے فرقہ وارانہ اختلافات کا مرہون منت تھا ۔ انگریز آباد کاروں نے بر صغیر کے ساتھ ساتھ اپنی دیگر نو آبادیوں میں بھی اس حکمت عملی کو اپنایا۔ جیمز کیرول برطانیہ کے اس کردار کے متعلق لکھتا ہے:

"روایتی طور پر استعماری قوتیں محکوم عوام کی آبادی کی ایک متحدہ مزاحمت برپا کر سکنے کی
صلاحیت کی عدم موجودگی پر انحصار کرتی ہیں ۔ سب سے کامیاب قابضین، مقبوضین کے
درمیان موجود اختلافات کا استحصال کرنے میں ماہر ہوتے ہیں ۔ یقینا برطانوی سلطنت کی
کامیابی کی کہانی بھی یہی ہے ، اس کی مقامی باشندوں کے مابین نفرت کی پرورش کرنے کی
میراث ہر اُس جگہ دیکھی جا سکتی ہے جہاں ، جہاں یونین جیک لہرایا ۔ پاکستان اور انڈیا میں
ہندو، مسلم نفرت ، آئر لینڈ مینکیتھو لک پروٹسٹنٹ نفرت ، اور جی ہاں جدید اسرائیل میں
یہودی،عرب نفرت کی صورت میں ۔"(۲)

برصغیر میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی استعمار کے پنجوں تلے دبے مقامی باشندے کے پر پھرپھڑانے کی بھرپور کوشش تھی ۔ ۱۸۵۷ء تک بر صغیر میں مذہبی رواداری عروج پر تھی۔برصغیر کا کثیرالمذاہب معاشرہ مذہبی عصبیت سے پاک تھا۔ مغلیہ دور میں مسلمان بادشاہ اس سرزمین کو اپنا وطن سمجھتے تھے ۔ انھوں نے سیاسی طور پر بر صغیر میں پرامن معاشرہ قائم کیا ۔مذہبی رواداری قائم رکھنے کے لیے انھوں نے کئی عملی اقدام کیے ۔ ۱۸۵۷ء سے قبل برصغیر کے عوام خود کو ایک وحدت اور انگریزوں کو غاصب سمجھتے تھے۔ جنگ آزادی میں ہندو، مسلمان اور دیگر مذاہب کے لوگوں نے شرکت کی ۔ اس جنگ کے بڑے راہنما انگریزوں کی فرقہ وارانہ حکمت عملی سے واقف تھے۔ بریلی میں خان بہادر نے روہیل کھنڈ کے صوبے سے آزادی کا علم بلند کیا اور اسے آزاد کرالیا ۔ وہ والیِ بریلی حافظ رحمت اللہ کا پوتا تھا۔ خان بہادر دور بین شخص تھا اور انگریزوں کے حربوں سے بہ خوبی واقف تھا۔ جنگ کے آغاز کے بعد اُس نے روہیل کھنڈ کے تمام اضلاع میں اور بادشاہ کے پاس اپنے ہاتھ سے ایک عرض داشت لکھ کر بھیجی ۔ اس نے لکھا کہ انگریز پھر تفرقہ ڈالنے کا پرانا حربہ استعمال کریں گے۔ وہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑ کا ئیں گے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اکسائیں گے ۔ ہندو بھائیوں کو چاہیے کہ اب وہ ان کے ہاتھ میں نہ پڑیں ۔ امید ہے کہ ہندو بھائی ان کے جال میں نہ پھنسیں گے ۔ ہوشیار، چالاک ہندو بھائیوں سے کہنا بہت ضروری ہے کہ انگریز اپنے وعدے کو ہرگز پورا نہیں کرتے وہ مکاری و غداری کے بہت عادی ہو چکے ہیں ۔(۳)

مر ہٹوں کا سردار اور ناگ پور کے نواب کا متبنیٰ نانا صاحب ہندو مسلم اتحاد کا قائل تھا ۔ اس نے تحریک آزادی میں بھرپور حصّہ لیا ۔ وہ نیپال کی ترائی میں آخری معرکے میں مارا گیا ۔ تانتیا توپی، جھانسی کی رانی لکشمی بائی، منگل پانڈے ، جنرل بخت خان روہیلہ اور بے شمار دیگر ہندو مسلم ہندوستانی متحد تھے اور مذہبی عصبیت سے پاک تھے ۔۱۸۵۷ ء کی جنگ آزادی سے انگریز نے جو سبق سیکھے،ان میں سب سے اہم برصغیر کی مذہبی رواداری کی پامالی تھا۔ ۱۸۵۷ ء کے بعد انھوں نے اپنی پوری قوت بر صغیر کے پُر امن معاشرے کو چھوٹی چھوٹی اکا ئیوں میں تقسیم کرنے پر لگادی ۔

انگریزوں نے بر صغیر کے مذہبی روادار اور پر امن معاشرے میں بد امنی کے بیج بونے کے لیے دو سطحوں کو استعمال کیا ۔ پہلی سیاسی اور دوسری علمی۔ سیاسی طور پر کئی ایسے اقدام کیے گئے جن سے کسی ایک مخصوص مذہبی گروہ کو فائدہ ہو ، جس کے نتیجے میں دیگر گروہوں میں تشویش پیدا ہوا اور وہ بہ طور الگ مذہبی گروہ کے اپنے حقوق کے لئے سرگرم ہوجائیں ۔

برصغیر کے عوام کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ اپنے حقوق کا بہ طور ہندوستانی مطالبہ کرنے کی بجائے اپنے اپنے مذاہب کی بنیاد پر کریں ۔ جب کسی ایک مذہبی گروہ کو حکومتی اقدام سے فائدہ ہوتا تو دیگر گروہوں کے اندر اُس کے خلاف نفرت پیدا ہوجاتی ۔ آہستہ آہستہ بر صغیر کی مقامی سیاست کا رُخ آباد کار سے نجات کی بجائے گروہی فوائد حاصل کرنے اور ایک دوسرے کو زک پہنچانے کی طرف مڑ گیا ۔ پہلے تقسیم بنگال اور بعد میں اُس کی منسوخی جیسے واقعات کے ذریعے مذکورہ مقا صد کو حاصل کیا گیا۔ آباد کارکی ہندو نواز اور مسلم کش پالیسی کے پیچھے بھی اصل مقصد اُن کے مابین مذہبی اختلافات کو ہوا دے کر اپنی دکانداری چمکانا تھا۔

علمی سطح پر نو آبادیاتی مقاصد حاصل کرنے کے لیے انگریزوں نے ہندوستان کے لسانی پہلو پر ضرب لگائی۔مغرب نے جو نوآبادیات بنائیں، ان کا تفصیلی علم حاصل کیا۔ ان کی زبان ،تاریخ ، ثقافت ، مذہب ، فلسفہ اور ادب ، ہر شعبے پر مستشرقین نے کتب لکھیں اور اس علم کو اپنی طاقت بنا لیا ۔ اسی کی مدد سے وہ نو آبادیوں پر قبضہ قائم رکھنے کے قابل ہوئے ۔ مشرق کو اپنی نو آبادی بنانے کے لیے جب بر طانیہ اور فرانس حصہ دار بنے تو انہوں نے مشرق کی سر زمین کو آپس میں بانٹنے کے ساتھ ساتھ علم کو بھی آپس میں بانٹا ۔ دونوں ملکوں کے مستشرقین نے ایک دوسرے کی روایات سے فائدہ اٹھایا ۔ اس علم کی بدولت مغرب نوآبادیوں کے مقامی افراد کی فطرت ، ان کی کمزوریوں ، ان کی تاریخ اور زبان سے واقف ہوا اور یوں اس نے انہیں اپنے قابو میں رکھنے کے

لیے زیادہ بہتر طریقے اختیار کیے ۔کسی غیر ملکی زبان کو سیکھنے اور اس خطے پر تحقیق ومطالعہ کو وہاں کے لوگوں کی موافقت سے قبضہ کرنے کے پروگرام میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔مغرب نے نہ صرف اپنی نو آبادیوں میں مشرق کے مطالعے کے ادارے قائم کیے بلکہ ایسے ادارے نوآباد ملکوں میں بھی وجود میں آئے۔ مطالعات مشرق کے ان اداروں کا مقصد علمی کی بجائے سیاسی تھا۔ ان اداروں میں نو آبادیات کی تاریخیں نوآباد کار کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھی گئیں ۔ ان کی زبان ،ثقافت اور مذاہب پر ایسی آراء دی گئیں جو نو آباد یاتی نظام کو قائم رکھنے میں معاون تھیں۔ گویا علمی منصوبوں کی آڑ میں مقامی باشندے کی دماغ شوئی کرکے اسے وہ تصور ذات قبول کرنے پر مجبور کردیا جاتاہے جو آباد کا ر فراہم کرتا ہے۔سعید ایک مستشرق لاسویل کے نظریات کا حوالہ دیتاہے:

’’مشرقی زبانیں کسی پالیسی کے مقصد کا حصہ ہیں اور ان کا مطالعہ ایک ایسا ہتھیار بن جاتا ہے جس کی مدد سے لاسویل کے نظریات پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے نظریات کے مطابق لوگ کیا ہیں اور وہ کیا سوچتے ہیں، اہم نہیں بلکہ یہ اہم ہے کہ ان کو کیا بنایا جاسکتا ہے اور ان کو کیا سوچنے کی طرف لایا جاسکتا ہے۔" (۴)

فارسی اپنے اندر خوئے سلطانی سموئے ہوئے تھی۔ انگریزوں کی آمد سے قبل زبانوں کا مذہبی تشخص برصغیر میں موجود نہ تھا۔ فارسی مدرسونمیں بلاتخصیص مذہب، ہندو اور مسلمان پڑھتے تھے۔ انگریزوں نے فارسی کو مسلمان حکمرانوں کی زبان قرار دے کر ہندوئوں کی ہمدردیاں حاصل کر لیں۔ بن فارسی کے مقابلے میں اردو کے عام فہم اور مقامی زبان ہونے کی دلیل دی گئی۔ فارسی کے اسلامی تشخص کو اس شدت سے ابھارا گیا کہ ہندو اکثریت نے اس کے ختم کیے جانے پر کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ عدالتوں میں فارسی سے اردو زبان کی تبدیلی کے ضمن میں مقامی عدلیہ سے رائے طلب کی گئی تو جسٹس ایورنارائین نے تجویز دی کہ

’’اس قسم کی تجاویز پر غور کرتے وقت ہماری عادات اور مقضیات کو زیر غور نہیں لانا چاہئے اور یا تو ہمیں یہ ثابت کرنا چاہئیے کہ فارسی زبان کو باقی رکھنا ایک معقول اور منصفانہ امر ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کوئی دوسری زبان جس کے وہ زیادہ عادی ہیں اس کو اختیار کرنا چاہیے اور اس سلسلہ میں ہمیں عارضی طور پر جو دقتیں پیش آئیں ان پر کوئی توجہ نہیں دینی چاہیے۔’’(۵)

نوآبادیاتی مقاصدکے تحت دیسی باشندوں کو ہر اُس نشان سے دور کرنا ضروری تھا جو انھیں کسی بھی حوالے سے اعتماد بخشتا۔ اس ضمن میں سفاکی کی حد تک سخت طرز عمل اختیار کیا گیا۔ نوآبادیاتی ثقافت میں مقامی کو انسان کا درجہ ہی حاصل نہیں ہوتا اس لئے اُن کی خواہشات اور عادات کو بھی درخور اعتنا نہیں جانا جاتا۔فارسی کی بجائے اردو کی ترویج انگریز حکام کی وہ تدبیر تھی جس کی مدد سے انھوں نے ہندوستانیوں کو آہستہ آہستہ ایک بڑے دھچکے کے لیے تیار کیا۔اُن کے اس تدریجی طرز عمل نے مقامی کو نفسیاتی طور پر قائل کر لیا۔ انگریز حکام نے اردو کے علاوہ مقامی زبانوں اور بولیوں کو بھی اہمیت دی۔ یہ ضروری سمجھا گیا کہ ہر گاؤں اپنی علیحدہ بولی یا کم ازکم بولی کے الگ لہجے کا حامل ضرور ہو۔ مشترکہ زبان وہ ڈور تھی جس نے ہندوستانیوں کی قومی وحدت کو بلا امتیاز مذہب ایک لڑی میں پرو رکھا تھا۔ ہندوستان کے ایک سرے سے جو لہر اٹھتی تھی، مشترکہ زبان کی بدولت آخری سرے تک پہنچتی تھی؛ نیز سنی اور سمجھی جاتی تھی ۔ لسانی حوالے سے ہندوستان کو چھوٹے چھوٹے علاقوں میں تقسیم کیا گیا اور ان میں لسانی تعصب ابھارا گیا۔ گریرسن نامی مشہور مستشرق نے ہندوستان کی زبانوں کا لسانی جائزہ لیا یہ جائزہ گیارہ جلدوں پر مشتمل تھا۔(۶)

’’ Linguistic Survey of India‘‘کے نام سے چھپنے والی یہ کتاب ہندوستان کی مقامی زبانوں اور بولیوں کا ایک ضخیم جائزہ تھی۔ گریرسن نے یہ کام حکومتی ایماء پر کیا۔ اس کی مدد کے لیے ہر علاقے کے سرکاری افسر کو مکمل تعاون کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اس منصوبے میں اس کی مدد کے لیے کئی منشیوں کو مقرر کیا گیا۔گریرسن کا یہ جائزہ نوآبادیات کو جاننے اور اس علم کو نوآبادیاتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی واضح مثال ہے۔ ہندوستان کی کثیرُ اللّسانی حیثیت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا ایک مقصد لسانی وحدت توڑنا بھی تھا۔

فارسی کو بے دخل کرنے کے بعد اردو کو اختیار کرنے سے بھی نوآبادیاتی مقاصد کی تکمیل نہ ہو سکی۔ اردو بھی مذہب اور نسل کی تفریق کے بغیر ہندوستان کے طول و عرض میں یکساں مقبول تھی۔ اس کا تعلق عوام سے تھا اور یہ عوامی وحدت کا اہم ذریعہ تھی۔

ڈاکٹر گلکرسٹ نے غالباً پہلے پہل وہ طریقہ دریافت کیا جس کے ذریعے اس عوامی زبان کو مذہب سے جوڑ دیا گیا۔ انگریزونکی آمد سے قبل ہندوستان کی مذہبی رواداری کے تذکرے تاریخ میں عام ملتے ہیں۔ نوآبادیاتی حکمت عملی کا ایک جزو اس رواداری کو ختم کرنا تھا۔ جیمز فاربس جو فاضل اور منتظم تھا ، ۱۷۷۸ء میں ’’مشرقی سوانح‘‘

نامی کتاب میں اس رواداری کا ذکر کرتا ہے کہ دواس قدر مختلف مذہبی اصولوں کے ماننے والوں میں اتنی رواداری کی مثال کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کے ایما پر للو لال جی نے ’’پریم ساگر‘‘ لکھی ۔ اس کی زبان میں عربی فارسی کے الفاظ کی بجائے سنسکرت کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے۔ گلکرسٹ نے ہی مسلمان منشیوں سے ایسی زبانی لکھوائی جس میں سنسکرت کی آمیزش سے گریز کیا گیا ہو۔ یوں زبان کو ہندو اور مسلمان کا جامہ پہنا دیا گیا۔جو زبان فارسی و عربی آمیز ہو اور فارسی رسم الخط میں لکھی گئی ہو، اُسے مسلمانوں کی اردو اور سنسکرت آمیز زبان جو دیو ناگری رسم الخط میں لکھی گئی اسے ہندوؤں کی ہندی قرار دیاگیا۔

انگریز مسلمانوں اور ہندوؤں میں سیاسی اور قومی انتشار کا بیج پہلے ہی بوچکے تھے۔ جہاں جہاں یہ اختلافات گہرے تھے وہاں وہاں ہندوؤں نے اس تقسیم کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یوں ہندوستانی مذہب کے ساتھ ساتھ لسانی بنیادوں پر بھی تقسیم ہو گئے۔۱۸۶۷ء میں بنارس کے کچھ ہندو رہنماؤں نے مطالبہ کیا کہ سرکاری عدالتوں اور دفاتر میں اردو اور فارسی کو مکمل ختم کر دیا جائے۔ اس لسانی تحریک نے پورے ملک میں یہ پیغام پھیلانے کی کوشش کی۔ اس تحریک کا پہلا دفتر بابو فتح نارائن کے مکان پر بنارس میں بنایا گیا ۔اس کا صدر دفتر الہٰ آباد میں قائم کیا گیا جس کے ماتحت پورے ملک میں کئی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں تاکہ پورے ہندوستان کے ہندوؤں کو اس تحریک میں شامل کیا جائے۔ بابوشیوپرشاد اس تحریک کے روح رواں تھے۔ (۷)

سرسید نے جب اردو ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کیا تو انگریزوں سے زیادہ اس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے ہوئی۔ہندو احیا پرستی کی تحریکوں کے لیے یہ تقسیم نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی اور اس نے ہندی، ہندو، ہندوستان کے نعرے کا روپ دھار لیا۔ مذہبی ہندو طبقے نے اس کا خیر مقدم کیا ۔ یوں ملک کے کونے کونے میں بولی جانے والی زبان جس کی جغرافیائی وسعت کا اعتراف گارساں دتا سی نے بھی کیا تھا، محض ایک اقلیت کی زبان بن کر رہ گئی۔ سید سلیمان ندوی اس لسانی حکمت عملی کے متعلق لکھتے ہیں:
’’ابھی اٹھارویں صدی بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ فرنگی جادوگروں کے منتر سے اردو اور ہندی کے دو خاکی پتلے فولادی سپاہی بن کر ملک کے طول و عرض میں مرنے کٹنے لگے ۔ہندوبھائیوں کے دلوں میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اب جب مسلمانوں کی سلطنت کے دباؤ سے وہ آزاد ہو چکے ہیں تو ہم کو اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہوجانا چاہیے۔ اس بنا پر انگریزوں کی تفریق کی سیاسی تحریک بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوئی اور سب سے پہلے اس کا اثر زبان کے معاملے میں ظاہر ہوا۔‘‘(۸)

نوآبادیاتی نظام کی بقا کے لیے جو حیلے استعمال کیے جاتے ہیں، مقامی باشندوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا اُن میں سے اہم حربہ ہے۔ پرتگال کے بادشاہ نے ہندوستان کو اپنی نوآبادیات میں تبدیل کرنے کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہاں بھیجے جانے والے اپنے نمائندے البوکریک کو فرقہ وارانہ پالیسی اختیار کرنے کا مشورہ دیاتوالبوکریک نے اس وقت یہ جواب دیا تھا کہ یہاں کے لوگوں کو تقسیم کرنا ممکن نہیں۔پرتگالیوں کے مقابلے میں برطانوی استعمار نے یہ چال بہ خوبی استعمال کی۔لسانی اور مذہبی تفریق نے ہندوستان کے مقامی باشندوں کے مابین تفریق کا ایسا بیج بویا جو آج تک پھل پھول رہا ہے۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندو اور مسلمان دونوں اکٹھے تھے۔ اس موقع پر انگریزوں نے سکھوں کو دونوں قوموں سے متنفر کرکے اپنے مفادات حاصل کیے۔ لسانی اور مذہبی بنیادوں کی تفریق ہندوستان کی دونوں بڑی اقوام کو ایک دوسرے کا دشمن بنا گئی۔

انگریزوں کی مندرجہ بالا پالیسیوں کا بالآخر یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ہندو قوم پرستی کا احیاہوگیا اورکروڑوں ہندو قوم پرستی کے خوفناک بت کی پوجا کرنے لگے۔ شیوا جی رانا پرتاب ان کے ہیرو ہو گئے۔ فرقہ وارانہ بلوے، لاکھوں انسانوں کے خون ناحق روز مرہ کا معمول بن گئے۔ (۹)

مذکورہ بالا نکات کو مد نظر رکھتے ہوئے قر ۃ العین حیدر کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان ناولوں میں برّصغیر کے حقیقی معاشرے کی روح سانس لیتی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں بر صغیر کے اصل معاشرے کی بازیافت کرتی ہیں ۔ ان کے ناولوں میں انڈیا اور پاکستان کی وہ سرزمین موجود ہے جہا ں بھگتی تحریک نے جنم لیا ۔ بدھ بھکشوؤں، ہندو یوگیوں اور بابا گورونانک نے امن و آشتی کے نعرے لگائے اور مسلم صوفیا نے امن اور محبت کا پیغام عام کیا۔

وہ برصغیر جو مذ ہبی و ثقافتی ہم آہنگی کا نمونہ ہے،جہاں ہر مذہب کا رہنے والا اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہے،" آگ کا در یا"کاابتدائی حصہاسیقدیم ہندوستان کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔وہ ہندوستان جہاں صوفیا اور بھگت مل کر امن و آشتی کا پیغام عام کر رہے ہیں ۔اس حصے میں گوتم ،ہری شنکر اور چمپک کے کردار اہم ہیں۔ گوتم ایک برہمن ہے اور اعلی تعلیم حاصل کر رہا ہے ۔ہری شنکر بدھ بھکشو بن چکا ہے اور چمپک دنیا تیاگ کر

ویہار میں جانے والی ہے۔ان تینوں کا وطن ثقافتی طور پر ہم آہنگ ہے ۔وہاں مسلمان ،ہندو اور بودھ ایک دوسرے کااحترام کرتے ہیں ۔جنگیں سیاست کی بنیا د پر ہوتی ہیں لیکن فرقہواریت کا دیو کہیں نظر نہیں آتا ۔
آگ کا دریا کے راوی کے مطابق:

"پچھلے تین سو سال سے اس صوفی بھگتی مارگ پر ایک بڑا خوبصورت قافلہ رواں تھا۔ اس قا فلے میں کیسے کیسے لوگ شامل تھے ۔اجمیر کے معین الدین اور ایٹے کے امیر خسرو اور دلی کے نظام الدین اور گجرات کے نر سنگھ مہتا اور بنگال کے پیر بھوم کا چنڈی داس اور بہار کی متھلا پوری کے ودیا پتی اور مہارا شٹر کا درزی نام دیو،پریاگ کے راما نندا اور جنوب کے مادھو اور ولجھ اور بادشاہوں اور چھتر پتی راجاؤں کے درباروں اور امراء،وزراء اور سپہ سالاروں کی دنیا سے نکل کر کمال نے دیکھا کہ اس کی دوسری دنیا میں مزدور اور نائی اورموچی اور کسان اور غریب کاریگر آباد تھے۔یہ جمہوری ہندوستان تھا اور اس ہندوستان پر ان خرقہپوشوں کی حکومت تھی ،کاریگروں کی منڈلیاں ان سے وابستہ تھیں ۔اسلام کی مساوات ان ہندو بھگتوں کو متاثر کر رہی تھی ۔اسلام تو امن پسند صوفی اس دیس میں پھیلا رہے تھے؛یہاں تلوار کا ذکر کہاں تھا۔ ہزاروں برس کے ستائے ہوئے اچھوت ان سنتوں کے پاس بیٹھ کر رام کا نام لے رہے تھے ۔اونچی ذات کے برہمنوں کا یہاں کون دخل تھا ؟یہ بڑی نرالی دنیا تھی ۔اس میں ہندو مسلمان کا سوال نہیں تھا۔"(۱۰)

قر ۃ العین حیدر کے ناولوں کا غالب منظر نامہ نو آبادیاتی دور ہے ۔مسلمان بادشاہوں کے ہاتھ سے ڈھیلی پڑتی سلطنت کی طنابیں ،تاجر سے آقا بنتا انگریز کردا ر اور خوشحالی سے بدحالی کا سفر کرتے مقامی باشندے ان کے کینوس پر ڈوبتے ابھرتے ہیں ۔ آگ کا دریا "میں شاداب بنگال کی اجڑتی صنعتیں اور بنجر ہوتی زمینیندکھائی گئی ہیں ۔بنگال ملک کا زرخیز ترین صوبہ تھا ۔مسلمان نوا بین زرعی پیداوار کی مقدار کے مطابق ٹیکس لیتے، اگر کسی سال فصل خرا ب ہوجاتی تو ٹیکس بھی معاف کر دیا جاتا ۔انگریزوں نے اس خطے میں دوامی بندوبست رائج کیا ۔ملک کی مصنوعات کی بر آمد پر محصول لگائے ۔ہرے بھرے کھیت بنجر ہونے لگے ۔زرعی پیداوار کی مقدار کی شرح کو دیکھنے کے بجائے مستقل لگان لیا جانے لگا۔بعض اوقات پوری فصل لگان کی ادائیگی میں اٹھ جاتی۔ڈھاکہ کی ململ کی بجائے برطانوی کپڑے کو فروغ دینے کے لیے جولا ہوں پر ستم ڈھائے گئے ۔کھیتوں سے کپاس کمپنی کی شرح پر خریدلی جاتی ۔پارچہ بانی کی ہر ممکن طریقے سے حوصلہ شکنی کی گئی ۔بنگال کے کر گھے ویران ہو گئے ۔بنگال قحط سالی کا شکار ہو گیا لیکن کمپنی کے گماشتے پورا پورا محصول وصول کرتے رہے ۔بنگال کی فاقہ کش نئی نسل سوچ بھی نہ سکتی تھی کی اُن کی میراث کیا تھی۔آگ کا دریا کا بنگالی کردار رادھے چرن سے ڈھاکے کا انگریز کلکٹر کہتا ہے کہ وہ زمینداری کا نیا نظام ان کے فائدے کے لئے رائج کر رہے ہیں ۔مسلمان نوابوں نے انھیں اپنی بد انتظامی سے تباہ کر دیا تھا ۔رادھے چرن اسے جواب دیتا ہے:

" تم جھوٹ بولتے ہو صاحب ہمارے نوابوں کے یہاں بد انتظامی نہیں تھی ۔میں کا یستھ
ہوں میرے پرُکھ صدیوں سے مرشد آبادمیں حکومت کا انتظام کرتے آئے ہیں ۔میں
آج بوڑھی گنگا کے کنارےاس چھونپڑی میں رہ رہاہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ
میں نے اپنی خوشحالی کے ساتھ ساتھاپنے ہوش و حواس بھی کھو دیے ہیں ۔مجھےمعلوم
ہے کہ تم جھوٹ بکتے ہو۔" (۱۱)

مذہبی ہم آہنگی کی یہ فضاپورے ہندوستان کا حصہ تھی ۔چند ایک کے علاوہ بیشتر مسلمان حکمران بر صغیر میں لوٹ کھسوٹ کے ارادے سے نہیں آئے تھے ۔انھوں نے آکر اس ملک کو اپنا وطن بنایا ۔اُن کے ادوار میں برّصغیر کی دولت کہیں باہر منتقل نہیں ہوئی بلکہ اس نے یہیں کی زمینوں کو شاداب کیا۔ مسلم حکمرانوں نے عمارتیں بنوائیں ،رعایاکی فلاح کے لیے اقدامات کیے ۔یہیں شادیاں کی اور مقامی رنگ میں گھل مل گئے۔ انھوں نے مذہب اسلام کی سکھائی رواداری کے مطابق یہاں کے دیگر مذاہب کو بھی پھلنے پھولنے کی اجازت دی ۔برّصغیر کے حکمرانوں کے اس رویے نے ہندو اور مسلمان دونو ں اقوام کو یکساں ترقی کے مواقع فراہم کیے۔حکومتی عہدے دارو ں میں مسلمانوں کو ساتھ ساتھ ہندو بھی شامل تھے ۔بعض اوقات دربار کے نہایت اہم عہدوں پر ہندو فائز ہوئے۔" آگ کا دریا

" میں لکھنئو کی تہذیب اپنے پورے کرّ وفر سے نظر آتی ہے ۔ وہ لکھنئو جہاں کے لوگ باوقار ،نفیس اور پر امن ہیں ۔شجاع ا لدولہ ،آصف الدولہ کا لکھنئو جہاں زندگی کی ہما ہمی اپنے عروج پر ہے۔رقاص ،بھانڈ ،جل ترنگیے ،بین کار،باجپی ،برہمن ،شاعر ،مرثیہ گو،داستان گو ،کایستھ ،فوجی ،بانکے،چنڈوباز،بھگت باز ،نقال ،بہروپیے ،عالم ،فاضل ،کلاونت مل کر اس رومانی معاشرے کو تشکیل دیتے ہیں ۔لکھنئو کی بادشاہت ہندو اور مسلمانوں کے لئے قومی ریاست کا درجہ رکھتی تھی ۔گڑھی کا ٹھاکر اور محل کا نواب مضبوط رشتوں میں بندھے تھے ۔اُن کے دکھ سکھ یکساں تھے ۔شجاعت ،آن پر قربان ہو جانا ،شرافت ،وفاداری، نیکی اور احسان مندی ان کا شیوہ تھا۔ہندو کی

بیٹی علاقے کے تما م مسلمانوں کی بھی بیٹی سمجھی جاتی تھی اور یہی رتبہ مسلمان کی بیٹی کو حاصل تھا۔راوی کے مطابق:

"مذہبی تفریق کو پر جا کا خالص ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔محرم میں بلوے ہوتے ہیں
نہ مسجدوں کے سامنے باجہ بجایا جاتاہے۔ہندو تعزیہ داری کرتے ہیں اور مسلمان
دیوالی مناتے ہیں ۔۔ ساری سلطنت میں ہندو راجاوں نے مساجد اور امام باڑے
بنا رکھے ہیں ۔ لکھنئو سے اسی میل کے فاصلے پر بہرائچ ہے جسے ہزاروں سال
پہلے شراوستی کہتے تھے،جہاں سالار مسعود غازی کی درگاہ ہے ۔ہر سال بڑی دھوم
دھام سے ہندو اور مسلمان مل کر ان کی بارات نکالتے ہیں ۔"(۱۲)

قرۃالعین حیدر کے ناولوں میں ہندو ستان کے ہزاروں سال قدیم معاشرے کی جھلکیوں سے لے کر تقسیم کے بعد تک کا ہندوستان نظر آتا ہے۔بیسویں صدی کا برّصغیربھی اُن کے ناولوں میں رواداری کی اسی روش کی پیروی کرتا نظر آتاہے جس کا آغاز قدیم بر صغیر میں ہوا تھا۔۱۹۴۰کا لکھنئو بھی ہندو مسلم تفریق سے عاری ہے ۔اس مستحکم معاشرے میں باوضع ،خوشحال اور باعزت لوگ ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی ۔ان کے رسوم و رواج ایک سے تھے اور بہ قول راوی رنج اور خوشیاں،مسائل یکساں تھے ،ان کے فرنیچر ،ان کے باغوں کے پودے ،ان کی کتابیں ،لباس سب چیزیں ایک سی تھیں ۔ان کے ملازم ،ان کے نام،ان کی دلچسپیاں۔۱۳

قرۃ العین حیدر معاشرے کی اس روح کی باز یا فت بیرونی اور اندرونی دونوں سطحوں پر کرتی ہیں ۔ان کے ناولوں میں پڑھے لکھے شہری طبقے سے لے کر ان پڑھ دیہاتی طبقے کے خیالات کی عکاسی کی گئی ہے شہروں اور دیہاتوں میں امن اور روا داری کی فضا واضح دکھائی دیتی ہے۔جو معاشرہ قرۃالعین حیدر کے ہاں موجود ہے وہ اس معاشرے سے قطعی مختلف ہے جو مستشرقین کی تحریروں میں دکھائی دیتاہے۔قرۃالعین کا برّصغیر وہ ہے جس میں مادھو پور کی ہندو لڑکی کی بیاہ کر کرن گنج جائے تو مادھو پور کا مسلمان کسان کبھی کرن گنج میں پانی نہیں پیے گا کیوں کہ وہ اس کی بیٹی کا سسرال ہے۔انسانیت کی یہ اقدار یہ برّصغیر کا اصل روپ ہیں جنھیں نوآبادیاتی کلامیے نے دھندلا دیا۔مسلمانوں کی بارات اگر کسی ایسے گاؤں سے گزرتی جہاں اُن کے گاؤں کی لڑکی بیاہی ہوتی تو بارات کا ہر فرد ہندو بیٹی کو پیسے دئے بغیر آگے نہ جاتا۔ہندوؤںکی شادی میں پورے گاؤں کے مسلمان اور ہندو مل کردیسی گھی او دودھ مہیا کرتے۔ ہندو،مسلم اور مقامی عیسائی مل جل کر اپنے تہوار مناتے ۔چھوٹی اور بڑی دیوالی ،بھیادوج تہوار،کھپچڑی کا تہوار،بسنت،پنچمی،محرم،غمِ حسین اور عیدین مشترکہ تہوار سمجھے جاتے۔ قرۃ العین حیدر کے ہندو کردار خلاف طبع بات نظرآنے پر لاحول پڑھتے ہیں اور عیسائی فقیرنی مولا حسین کے نام پر بھیک مانگتی ہے ۔

بیسویں صدی کے بر صغیر کا چہرہ لکھنئو تھا۔جوروایت لکھنئو میں جنم لیتی تھی اور پورے ہندوستان میں پھیل جاتی۔ یہ لکھنئو پوری چہل پہل کے ساتھ ــــ’’آگ کا دریا ‘‘اور’’ میرے بھی صنم خانے‘‘ میں موجود ہے ’’۔میرے بھی صنم خانے‘‘میں محرم کی منظر کشی یوں کی جاتی ہے :

’’لکھنئو کا محرم۔۔۔جب گلی گلی امام باڑے سجتے تھے اور شربت کی سبیلیں لگائی جاتی تھیں او ر
ہندو مسلمان ،شیعہ،سنی اکٹھے ہوکر حسینؓ مظلوم انسانیت کے سب سے بڑے ہیرو کی بارگاہوں
میں اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تھے چوبیس گھنٹے ماتمی نقارہ بجتا رہتا تھا امام باڑوں میں چراغاں کیا
جاتا تھا ،ہندو عورتوں کی ٹولیاں پوربی زبان میں کہے ہوئے نوحے اپنے طریقے سے گاتی ہوئیں
سڑکوں اور گلیوں میں سے گزرتی رہتی تھیں۔" (14)

قرۃ العین حیدر نے اپنی تحریروں میں نوآبادیاتی بیانیے کے مقا بل متبادل بیانیہ پیش کیا ہے۔ مستشرقین نے اپنی تحریروں میں بر صغیر کاجو چہرہ نمایا ں کیا وہ فرقہ واریت اور نسلی عصبیت کے غازے سے لتھڑا ہوا تھا ۔سپی واک کے مطابق مغرب نے تیسری دنیا کے موضوعات کا نوآبادیاتی مقاصد کے تحت مطالعہ کیا ۔مغربی دانشوروں نے یہ تحقیق کرتے ہوئے غیر/وہاں موجود کی اصطلاح استعمال کی ۔مغرب نے مشرق کو ایسی چیز سمجھا جس کے مطالعے سے علم اخذ کرکے یورپ لایا جاسکتا ہے اور یہاںاُس علم کو اپنے فوائد کے لیے استعمال کرنے کی غرض سے علمی کلامیوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔مغرب نوآبادیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اُن کے اصل باشندوں کی آواز کو اہم نہیں گردانتا۔ گویایہ سفید فام لوگوں کی سفید فام قارئین سے رنگدار لوگوں کے متعلق گفتگوبن جاتی ہے ۔وہ اس حقیقت کا اظہار کرتی ہے کہ مغرب محض اپنے آپ سے اور اپنی ہی زبان میں گفتگوکررہاہے۔

تیسری دنیا اس کے لیے غیر ہے جس کے متعلق خام مواداجناس کی کٹائی کی مانند اکٹھا کرکے مغرب کے علمی کارخانوں میں علمی کلامیے بنائے جاتے ہیں تاکہ مغربی قاری اور مصنف ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ وہ غیر کے لیے کی گئی مغرب کی کسی کوشش سے متاثر نہیں ہوتی ۔اسے یقین ہے کہ مغرب خود کو معروض کے طور پرپیش کرنے کے جنون کا شکار ہے۔

مغربی کلامیونکے نو آبادیاتی مقاصد کے لیے استعمال کو وہ ایک اہم اصطلاح سے واضح کرتی ہے۔ علمی تشدد (episteemic violence)وہ اصطلاح ہے جواس نے مشیل فوکوسے مستعارلی ہے۔سپی واک کے مطابق جس علم کے ذریعے غیر کی ثقافت کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہ معصوم نہیںہوتا بلکہ اپنے پیداکرنے والے کے مفادات کامظہر ہوتا ہے اس لیے سبلٹرن سے مخاطب ہونے کی تمام بیرونی کوششیں اس علمی تشدد سے بھر پور ہیں۔مغرب کی علمی کلامیوں نے تاریخ کی حاشیے سے لگائی گئی اقلیتوں کو آواز دینے کی کوشش میں اُن پر مزید علمی تشدد کیا ہے۔ (۱۵)

وہ ٹکڑے جو آسانی سے ان کلامیوں میں جگہ نہیں بناسکتے انھیں بھلادیا جاتا ہے۔اس تحقیق /علم نے مغرب کو دوسری ثقافتوں کو اپنا غلام بنانے کا جواز فراہم کیا۔کلونیل ڈسکورس نے نوآبادیاتی نظام کا جواز فراہم کیا۔مغربی دانش ور دوسری ثقافتوں کے متعلق اپنے پیش کردہ علم کو واضح طور پر پیش کرتے ہیں۔وہ خودکو بے غرض، بالکل درست، سائنسی طرز عمل کے حامل اور اخلاقیات سے مرصع قرار دیتے ہیں جبکہ سپی واک کے مطابق اُن کا تیسری دنیا کے متعلق علم ہمیشہ سیاسی اور معاشی مفادات سے بھرپور رہا۔

آباد کار کی جس روش کو سپی واک علمی تشدد کا نام دیتی ہے اس اس کی طرف قرۃالعین حیدر نے بھی اشارہ کیا ہے۔اُس مطابق ابتدامیں جو انگریز مستشرق برّصغیر میں آئے وہ نو آبادیاتی نظام کی بساط کا مہرہ نہ تھے یا اس وقت تک برطانوی تاجروں نے بر صغیر کی شہنشاہی کے خواب سیکھنے شروع نہ کیے تھے اس لئے اُن کی تحریروں میں بر صغیر کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔وہ غیر ملکی مبصرین جومغلوں کے زوال کے وقت آئے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ طوائف الملوکی کے ہوتے ہوئے یہاں ہندو مسلم امتیاز نہ تھا۔جدا کرو اور حکومت کرو کی حکمت عملی انیسو یں صدی میں اختیار کی گئی ۔انیسویں صد ی کے متشرقین نے ہندوستان کو ویسا دکھا یا جیسا دکھا نا آباد کاروں کے مفاد میں تھا۔برّصغیر کی اقوام کی الگ الگ تاریخیں لکھی گئیں ،اُن کی کثیر اللسانی حیثیت کو اجاگر کیا گیا ۔نسل ،زبان اور مذہب کی بنیاد پر انھیں الگ گروہوں کی شناخت دی گئی۔
لکڑیوں کے اس گھٹے کو الگ کرنے کے بعد اس کے ایک حصے کے خلاف دوسرے حصے میں نفرت پیدا کی گئی ۔ہندوؤں کے لیے لکھی گئی تاریخوں میں اُن پر کیے گئے خود ساختہ مسلم بادشاہونکے مظالم کا تذکرہ کیا گیا ۔مسلمانوں کو ہندوئوں کی بت پرستی کے خلاف اکسایا گیا ۔مستشر قین نے مذاہب کے اندر بھی فرقہ ورایت کا زہر بھرنے کی کوشش کی۔مسلمانوں کے مسالک کی شناخت کو ابھارا گیا ۔ہندومت میں یہ کام شودر اور برہمن کو آمنے سامنے کھڑا کر کے لیا گیا ۔

"آگ کا دریا"کا سرل ایشلے اور اس کا دوست بشپ ہیبر اس گنگا جمنی تہذیب سے بھر پور فوائد حاصل کرتے ہیں ۔ہندو راجاؤں کی بنوائی ہوئی مسجدیں اور مسلمان بادشاہوں کے بنوائے ہوئے مندروں اور گورداروں کو دیکھنے کے بعد اپنے سیاحت ناموں میں لکھتے ہیں کہ اس ملک کا ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔وہ برطانوی حکومت کو مشورہ دیتے ہیں کہ ان وحشیوں کو جہالت اور تعصب سے نجا ت دلانے کے لیے مزید انجیلیں اور بندوقیں بھیجی جائیں ۔ (۱۶)

یہ وہ ہندوستان ہے جس میں مسیتا بیگ کوتوال نے عہد سعادت علی خاں کے دھومی بیگ کوتوال کی انصاف اور امن پروری کی روایات کوقائم رکھاہے۔شہروں میں سکون ہے۔نامی ڈاکوؤں کو محرم منانے کے لیے عارضی طور پر رہا کیا جاتا ہے اور پھر وہ جیل میں خود واپس آ جاتے ہیں ۔بہو بیٹیوں کی عزتیں محفوظ ہیں۔ کئی مسلمان صوفیا کے مزاروں پر ہندو اور مسلمان یکساں تعداد میں حاضری دیتے ہیں ۔ہندوؤں کے تہواروں پر انھیں مسلمان ہمسائے تحائف دیتے ہیں۔بنگال کے فاقہ کش ہندو مسلمان نوابین کے سنہرے دور کو یاد کر کے آنسو بہاتے ہیں ۔

دیس کے سب سے شاداب خطے میں انگریز ونکے دوامی بندوبست،لگان اور محصول کی ظالمانہ روش کے نتیجے میں قحط پڑنے لگے۔انگریز حاکم اسے سابقہ حکومتوں کی بدانتظامی بتلاتے لیکن ہندو اور مسلمان رعایا اُن کے دھوکے میں نہ آتی۔حالات جو بھی ہوں، تاریخ فاتح کے قلم سے لکھی جاتی ہے۔برطانوی مؤرخین نے اپنی تحریروں میں بر صغیر کی شادابی کو بدحالی اور اپنے دور کی قحط سالی کو خوشحالی لکھا ۔قرۃالعین اس فضا میں موجود ایک انگریز مشنری کے سفر نامے کاحوالہ دیتی ہیں جس نے بنگالیونکو مسلمان نوابین کا قدر دان پاکر سفر نامے میں قلم بند کیا:

"بنگال کا ہندو مسلمان نوابوں سے نفرت کرتاہے۔مسلمانہندوئونکےخون
کےپیاسےہیں ۔اسملک میں کوئی اتحاد نہیں ۔۔۔دراصل اسےایک ملککہنا
ہی نہیں چاہیے ،یہ بہت سی اقوام کا مجموعہ ہے۔جس میں ہندو مسلمان ہمیشہآپس
میںدست و گر بیان رہتے ہیں ،یہدونونکبھی اکھٹے نہیں ہو سکتے۔ " (۱۷)

شرق شناسی کو حکومت کی طرف سے بڑی ترویج ملی۔۱۸۵۰ء تک یورپ کی ہر بڑی یونیورسٹی نے علوم شرقیہ کے شعبے کا نصاب تیار کر لیا تھااور مشرق کے سفر کے لیے گرانٹ بھی دی جاتی ۔ یہ گرانٹ کسی ایشیا تک جغرافیائی انکشافات کے فنڈ یا سرکاری گرانٹ کی صور ت میں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ سفر کی یاداشت کتاب یار پورٹ کی ادارے سے اشاعت ہوگی ۔(۱۸)

ایسے لوگ جو ماہرین شرق تھے ۔ مشرق میں بطور سلطنت کے ایجنٹ مقرر کیے گئے ۔ انہی لوگوں کے ہاتھوں شرق شناسی اور مشرق پر قابوپانے کے اصول اپنی آخری یورپی شکل میں آئے ۔ سعیدمشرق کے مطالعات کے اس منظم سلسلے کو مفادات کا ایک گڑھ قرار دیتا ہے ۔ یہ معتبر لوگوں ، دانشوروں اور ماہرین کا ایک جال جو مشترکہ کاروباری اداروں ، فائونڈیشن ،تیل کمپنیوں ، عیسائیت کے تبلیغی اداروں کی فوج، سفارت کاروں، خفیہ اداروں ، امدادی رقوم اور مالی معاوضوں کی انجمن پر مشتمل ہے ۔ کام کرنے والوں اور اداروں میں درجہ بندی ہے ،تعلیمی اور تحقیقی اداروں کے جال ہیں، مراکز ہیںاورشعبے اور ذیلی شعبے ہیں ۔ تمام کے تمام اسلام اور مشرق کے بارے میں چند بنیادی اور غیر مبدل خیالات اور نظریات کو استنادد دینے اور اس استناد کو قائم رکھنے کے لیے کام میں دن رات مصروف ہیں ۔

مشرق کے متعلق تحقیقات نو آبادیاتی دور میں کی گئیں، یورپی ماہرین نے جب مشرق کا مطالعہ کیا تو وہ اس پر حاکم تھے۔ ان کی حیثیت غالب اور بر تر کی تھی ۔ حاکم نے جب محکوم کے متعلق کچھ جاننا چاہا تو اس پر حاکمیت غالب آگئی۔مستشرقین نے مختلف شعبوں میں جو علم تخلیق کیا اس میں یہی باور کرایا گیا کہ مغربی تہذیب بر تر ہے ۔ ہندوستان میں بنائے گئے نظام تعلیم میں طلبہ کو نہ صرف انگریزی علم بلکہ انگریزی نسل کی برتری کاسبق پڑھایا جاتا تھا۔ جب یورپی طاقت بے محابا بڑھی تو اس فکری نظام کی قوت بھی بڑھتی گئی جس میں سفید فام نسل کو ناقابل تردید حاکمیت کا یقین دلایا گیا تھا ۔ شرق شناسوں نے اسے ایک آفاقی سچائی کے طور پر پیش کیا کہ اہل یورپ کو حکومت کرنی چاہیے ۔ نہ کہ ان پر حکومت کی جانی چاہیے۔

یورپی مستشرقین نے برصغیر میں فرقہ ورایت کے بیانے کو ترویج دینے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کردی ۔سراج الدولہ سے انگریز وں نے متعدد باربدعہدی کی۔بگلی میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا ۔سراج نے انھیں اُن کی عہد شکنی پر سر زنش کی تو ایڈمرل واٹسن نے جواب دیا:

" میں ایسی آگ تمہارے ملک میں لگاؤں گا جسے گنگا کاسارا پانی نہ بجھا سکے گا ،
میں ایسی آگ لگاؤں گا ۔۔میں ایسیآگ ۔۔۔۔" (۱۹)

آباد کاروں کی لگائی ہوئی یہ آگ پورے برّصغیر میں پھیل گئی۔انھوں نے مسخ شدہ تاریخیں لکھ کر ہندوؤں کو باور کرایا کہ ایک اقلیت نے اُن کی اکثریت پر حکومت کر کے اُن کے حقوق غضب کیے ۔جو نسل ان ادوار کی چشم دید گواہ تھی اس نے تو ان کے پراپیگنڈے پر کان نہ دھرے لیکن اُن کی نئی نسلیں اس بّھرے میں آگئیں ۔ہندو مئورخین نے اپنی کتب کے لیے برّصغیر کا مسخ شدہ چہرہ دکھانے والی مستشر قین کی کتب کو بنیاد بنایا ۔جس کے جواب میں مسلمان مصنفین نے دفاعی حکمت عملی اختیا ر کی ۔جس عمارت کی بنیا دیں آباد کاروں نے رکھی تھیں اُس کی کئی منزلوں میں ہندو اور مسلمان دانشور وں نے اضافہ کیایہ صورت حال برّصغیر کے عام آدمی کے لیے بیحد تکلیف دہ تھی ۔

"آگ کا دریا "کی چمپاثقافتی طور پر ہم آہنگ معاشرے میں آنکھ کھولتی ہے۔وہ کاشی کی گلیوں اور شوالے کے گھاٹ اپنی ہندو دوست کی مانند اپنی ملکیت سمجھتی ہے۔بسنت کالج کے ترنگے کے نیچے کھڑے ہو کر جن گن من گاتے ہوئے وہ اُسے اپنا سمجھتی ہے۔لیکن جوں جوں ملک میں تقسیم کرواور حکومت کرو کی حکمت عملی کااطلاق ہوتا ہے تو وہ یہ جان کر غم ذدہ ہو جاتی ہے کہ ان شوالوں پر اس کا کوئی حق نہیں کیونکہ وہ ماتھے پر پابندی نہیں لگاتی اور تپلیشور کی آرتی اتارنے کی بجائے اس کی اماں نماز پڑھتی ہیں ۔وہ اپنے ملک میں رہتے ہوئے خود کو اجنبی محسوس کرتی ہے ۔(۲۰)

کرنل واٹسن کی لگائی ہوئی آگ کی لپٹیں بڑھتی گئیں اور ہندو ستان کا رہنے والاہر مسلمان وفادار یوں کی اس کشمکش کا شکار ہو گیا ۔اُسے کہا گیا کہ یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر لے یا ہندوستان چھوڑ دے ۔"ہندو" کی اصطلاح کے معنی بدل دئے گئے ۔پہلے ہندوستان ہر اُس شخص کا وطن تھا جو وہاں رہتا تھا لیکن اس اس آگ کی حرارت نے ہندو دھرم کے علاوہ کسی بھی دھرم سے تعلق رکھنے والے شخص کو تعصب کی بھٹی ّمیں پگھلادیا ۔

تقسیم سے قبل شروع کیے گئے اس ڈرامے مین ہندو اور مسلم دونوں کرداروں نے رنگ بھرے ڈرامے کے ہدایت کار خاموشی سے تماشا دیکھتے رہے۔تقسیم کے ساتھ ہی ہندو مسلم فسا دات شروع ہو گئے ۔پاکستان سے لٹے پٹے ہندو شرنار تھی ہندوستان پہنچے اور ہندوستان سے کٹے پٹے مہاجر پاکستان ۔میرے بھی صنم خانے میں تقسیم کے بعد کی کربناک صورت حال ملتی ہے۔

محب وطن پی ۔چو ہجرت کرنے کی بجائے اپنے آبائی علاقے میں رہ کر اپنی صلاحیتوں کو صرف کرنا چاہتا ہے۔وہ اُور اس کی بہن مل کر نیوا یرا کے نام سے پرچہ نکالتے ہیں او ر عوام کو باشعور کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔کرن بہادر ہری شنکر اور گوتم ہندو ہیں وہ برّصغیر کے مسائل سے بخوبی واقف ہیں اور مشترکہ دشمن کی چالونکو سمجھتے ہیں لیکن محب وطن پی چو اپنے ہی اطن میں فرائض منصبی نبھاتے ہوئے قتل کر دیا جاتا ہے اور کرن بہادر بھی اسی نفرت کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔پی چو اور خشندہ کا کرواہا راج اُن کے لیے اجنبی ہو جاتا ہے۔قرۃالعین حیدر نے اس نفسیاتی کرب کو کماحقہ پیش کیا ہے ۔مسلمان جاگیر داروں کی زمینوں پر شر نار تھیوں کے کیمپ بنا دئے گئے۔ اُن کے ملازمین نے زمینوں پر قبضہ کر لیا اور گھروں کو بلوائیوں نے آگ لگا دی ۔پاکستان جانے والی گاڑیاں کٹ گئیں ۔ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو ریل گاڑیوں کی کھڑکیوں سے اٹھا کر پھینک دیا جاتا۔

"یہ انکا قصبہ تھا۔جہاں سب مل کر سال بھر کو ئی نہ کوئی تہوار مناتے رہتے تھے ۔جہاں سبھی کا ایک دوسرےسے صدیوں کا بھائی چارہ اور ملاپ تھا ۔سبھی ایک دوسرے کو کسی نہ کسی رشتے داری کے نام سے پکارتے آئے تھے ۔سبھی ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے شریک تھے۔آج دس بلم برادری کی حفاظتمیں وہ اس قصبے میں داخل ہوئے تھے۔یہاں انھوننے ہولی پر حویلی اور محلے کے بچوں کے ساتھ ہوا میں گلال اور عبیر اڑایا تھا۔یہاں انھوں نے رام لیلا پر راونکے جلنے اور سروپ نکھار کی ناک کٹنے پر بچپن میں ایک دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اکٹھی خوشیاں منائی تھی۔یہاں انھوں نے دیوالی پر کھانڈ اور مٹی کے کھلونوں سے اپنے گھروندے سجا کر حویلی میں چراغاں کیا تھا۔یہاںانھوں نے بچپن میں دیوان خانے کی ڈیوڑ ھی کے کھرےپلنگوں پر کود کود کر شور مچا مچا کر لالہ اقبال نرائن اور دوسرے کائستھ منشیوں سے اردو اور فارسی پڑھی تھی اور آمد نامہرٹا تھا ۔یہ ان کا قصبہ تھا ۔یہاں کسی کو پتا نہیںتھا کہ کون ہندو ہے کون مسلمان ہے۔کون شیعہ ہے۔کون سنی ہے،اپنے دکھوںاور تکلیفوں کے باوجود زندگییڑی مکمل ،پر مسرت اور قانع تھی۔"(۲۱)

ایسے کئی پر امن قصبوں میں آباد کار کی لگائی ہوئی آگ کی حرارت پہنچی ۔وہ کھیل کے میدان جہاں کبڈی اور پتنگ بازی کے مقابلے اور مشاعرے منعقد ہوتے تھے ۔ایک دوسرے کے خلاف ہونے والے سیاسی جلسوں کے اکھاڑے بن گئے بھائی ،بھائی دشمن ہوگئے اور چھائونی سے انگریز میجر گورکھا سپاہیوں کے ہمراہ امن قائم کرنے کے لئے مختلف علاقوں میں پہنچ گئے آباد کاری کی مشنری خواتین اُن زخمیوں کا قرض آباد کاروں کے شانوں پر دھرا تھا۔

قرۃ العین برّصغیر کی قدیم خوب صورت روایات کے معدوم ہونے کا ایک سبب اردو ہندی تنازعے میں دیکھتی ہیں ۔برصغیر میں مذہب کی بنیا د پر زبان کو انگریزی نے تقسیم کیا۔فورٹ ولیم کا لج اور ڈاکٹر گلکر سٹ جواردو کے مربی سمجھے جاتے تھے بر صغیرکی تقدیر بدلنے کا سب سے اہم سبب بنے ۔فورٹ سلیم کالج نے اردو کا رسم الخط بدل کر عربی فارسی کے الفاظ کو سنسکرت سے بدل کر راتوں رات ہندوئوں کے لیے ہندو دھرم کی زبان اور مسلمانوں کے لیے اسلامی زبان مہیا کر دی گئی یہ محض زبان کی تقسیم نہ تھی بلکہ ایک تہذیب کی تقسیم تھی اس تقسیم کے بعد برّصغیر کی ہر شئے مذہب کے خانوں میں بٹتی چلی گئی آگ کا دریا کا کمال زبان کی تباہی کو کسی قوم کی سب سے بڑی وجہ سمجھتا تھا ۔وہ اپنی دولت لٹتے دیکھ سکتاتھا اردو کو اس کے اپنے دیس میں یکساں تعداد میں پڑھتے تھے ہندو راجائوں کی ریاست کا انتظام بھی فارسی میں ہوتا لیکن فورٹ ولیم کالج نے بر صغیر کے غیر میذب باشندوں کو زبان کا ایک نیا تصور دیا۔

قرۃ العین کے ناول استعمار کے بیانیوں کو جڑ پکڑ تا دکھا تے ہیں ۔یہ تناور پودے جن زہریلے پھلوں کی نسل تیار کرتے ہیں وہ اس معاشرے میں ایسے المیے پیدا کرتے ہیں جن کی اداسی پورے بر صغیر میں چھا جاتی ہے۔قرۃالعین حیدر کے ناولوں کے کبیری کردار ان بیا نیوں کا مکمل شعور رکھتے ہیں ۔وہ ان کی تمام حکمت

عملیوں سے واقف ہیں جنھوں نے ان کی پر امن فضائوں میں زہر گھولاہے۔ان کا کرب ناولوں کی بیرونی اور اندرونی سطحوں میں دکھائی دیتا ہے۔قرۃ العین حیدر کے گو تم لڑے بغیر زندہ رہنا چاہتے ہیں ،اہ امن کی باتیں کرنا چاہتے ہیں ،اپنی امین سے عشق کرتے ہیں اور ابنیا کے قائل ہیں۔قدیم اور جدید دونوں ادوار کے گوتم اپنے مسائل کا ادراک رکھتے ہوئے اور انھیں حل کرنے کی طاقت بھی لیکن استعمار کے نفرت انگیز بیانیوں کے سامنے اُن کی عوام بے بس ہے۔اُ ن کے کردار اس نفرت کو دیکھ کر حیرانی اور کرب میں مبتلا ہوتے ہیں ۔میرے بھی صنم خانے کاراوی حیرت سے سوچتا ہے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے ؟اس سرزمین پر یہ رو پہلے دھاراؤں کے مرغزار ،تلسی داس ،کبیر ملک محمد جا ئسی کی سرزمین ،پوراب دیس ،متھرا نگری اور جیالے سور ماؤں کی سر زمین۔ یہ بجائے دشمن کا مقابلہ کرنے کے آپس کے اختلافات کا شکار ہوگئے ہیں۔(۲۲)

اُس کے کردار بین المذاہب رواداری کا عملی نمونہ ہیں ۔وہ واشگاف انداز میں استعمار کے پر ا پیگنڈے کی قلعی کھول دیتے ہیں۔" آگ کے دریا" کا پرو فیسر چمپا کو یاد دلاتاہے:

"تم نے کبھی غور کیا۔۔۔کہ انگریزوں سے پہلے اس ملک میں ہندو مسلم فساد نہیں تھا ۔جنگیں ہوتی تھیں مگر وہ سیاسی تھیں ۔ہندو حکمرانوں کی فوج میں مسلمان جنرل اور سپاہی ہوتے تھے ۔مسلمانوں کی طرف سے ہندو لڑتے تھے ۔سپاہی گروہ بندیاں تھیں ،پھر انگریزوں نے دنیا پر یہ نیا نظریہ آشکار کیا کہ اس ملک میں ہزارونزبانیں بولی جاتی ہیں، ہزاروں قومیں بستی ہیں۔ ہندو مسلمان ایک دو سرے سے متنغر ہیں ،یہ ملک ایک ملک نہیں ہے ،محض جغرافیہ کی ایک اصطلاح ہے ۔ان کی لکھی ہوئی تاریخ کی کتابوں کے ذریعےنفرت کا بیج بویا گیا ۔مثال کے طور پر ایک کرنل ٹاڈ کی تاریخ راجھستان ہی دیکھ لو، یا انیسویں صدی کے سفر نامے۔"(۲۳)

اس کے ناولوں میں برّصغیر کا وہ معاشرہ موجود ہے جو آشتی کا نام لیوا ہے۔وہ مبصرین جو مستشرقین کے تخلیق کردہ علم کی بنیاد پر نئی عمارت اٹھانا چاہتے ہیں، اس معاشرے کو دیکھ کر ششدرہ رہ جاتے ہیں ۔برّصغیر کی اقوام کے مابین نفرت کا بیانیہ مستشرقین نے شدومد سے دہرایاہر نیا مستشرق اس تہذیب کے متعلق وہی غیر متز لزل خیالات رکھتا جواس کے پیش رو ترتیب دے گئے تھے۔

قرۃالعین کے کردار اس مایوس کن فضا میں آگہی کے چراغ روشن کرتے ہیں ۔قرۃالعین حیدر کے ہاں استعمار کے فرقہ وارانہ بیانیوں کا شعور موجود ہے۔ اُن کے کردار متبادل بیانیے کو فروغ دیتے ہیں جو پراپیگنڈے کی قوت سے متاثر ہوئے بغیربر ّصغیر کی حقیقی رواداری اورتہذیب و ثقافت کے مشترکہ سرمائے کو ترویج دیتا ہے۔"آگ کا دریا"کا ہری شنکر ہر دور میں ہندو ہے۔وہ علم کا استعار ہ ہے۔کمالنوآبادیاتی نظام کے کلا میوں کی آگہی رکھتا ہے ۔وہ کڑھتا ہے کہ مسلمان ہونے کی بنا پر اُس کی وفاداری ہندوستان میں مشکوک ہے اور اپنے آبائی علاقے سے محبت رکھنے کی بنا پر وہ پاکستان میں کہیں جاسوس نہ سمجھ لیا جائے ؟"میرے بھی صنم خانے" کی رخشندہ ایک مضبوط کردار ہے ۔اُس کاگھر ،غفران منزل، تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے صاحب علم دوستوں کے لیے کھلا ہے۔رخشندہ اور اس کے ساتھی استعمار کے خلاف آگہی پیدا کرنے کے لیے پرچہ نکالتے ہیں ۔یہ گروہ برّصغیر کے اُس طبقے کی نمائندگی کرتاہے جو استعمار کی حکمت عملی کو ڈی کنسٹر کٹ کر کے تعصب سے پاک رہتے ہیں ۔وہ کڑھتے ہیں کہ بر صغیر کے عوام اکھٹے ہو کر استعمار کا مقابلہ کرنے کی بجائے ان کے بہکاوے میں آ رہے ہیں۔

شرق شناسی کا ایک اور بڑا مفروضہ مشرق کو غیر مبدل سمجھنا ہے ۔ گویا وقت کے ساتھ مشرق اور مشرقی آدمی میں کوئی تبدیلی نہیںآئی اور کچھ مستشرقین کے مطابق تو حال کے مشرق کو دیکھنا ایسا ہی ہے جسے کوئی زمانہ قدیم کے مشرق کو دیکھے ۔ وہ ایک وسیع مشرق کے تمام باشندوں کو ایک جیسا قرار دیتا ہے ۔ اس حقیقت سے نظر چرا کر بھی کہ مشرق مغرب سے کہیں وسیع جغرافیائی خطہ ہے جس میں مختلف رنگ نسل اور مذہب کے لوگ آباد ہیں ۔ وہ تمام مشرقیوں کو ایک جیسا یعنی کمتر قرار دیتے ہیں اور وہ ایک دفعہ مشرق کا جو خاکہ بنا چکے ہیں اس سے ذرہ برابر بھی بدلنے پر تیار نہیں ہوئے ہر نیا آنے والا شرق شناس پرانی بنیادوں پر اپنی عمارت کھڑی کرتا وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ ان کے ترتیب دیئے گئے چہرے والا مشرق کبھی اپنی شکل بدل بھی سکتا ہے ۔وہ مشرق کے تمام لوگوں کو ایک سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے اور سعید کے مطابق انہیں یقین تھا کہ برسوں پر محیط شرق شناسی کا حاصل یہ علم آزمودہ اور تغیر نا پذیر ہے ۔

مغرب نے مشرق کے متعلق ایک مرتبہ نظریات قائم کر لیے اور پھر کسی بھی نئی بات کے لیے دروازے بند کر لیے ۔وہ انھیں مفرو مفروضونپر یقین رکھتے ہیں جواس سے قبل کے شرق شنا سوں نے گھڑے ہوتے ہیں ۔کلیشے بن چکے یہ تصورات اُن کے لیے غیر مبدل تھے۔ آگ کا دریا میں مغربی اخباری نما ئندہ برّصغیر کے تعلق رکھنے مختلف المذاہب لوگوں کو اکھٹا دیکھتا ہے۔تو اپنے شرق شنا سوں کی قائم کردہ اتھارٹی کو چیلنج ہوتا محسوس

کرتاہے ۔اُنھیں یکجا دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے۔اُس کی ساری زندگی برّصغیر کے لوگوں کے آپس کے سیاسی جھگڑوں ،تنازعوں اور خونریزوں کی خبریں چھا پتے گزری ہے۔وہ اُن سب کو ایک آہنگ پر قائم دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

بنگال کا صوبہ نو آبادیاتی کلامیوں کا شکار بننے والے علاقوں میں سر فہرست تھا ۔ انگریزوں نے پہلے تقسیم بنگال کے ذریعے ہندوئوں اور مسلمانوں کے الگ الگ وجود کو شناخت دی اور پھر اسے منسوخ کر کے دونوں کے مابین نفرت کے بیج بوئے ۔فرقہ واریت کی ترویج سرکاری سرپرستی میں کی گئی لیکن جنون کی لہر گزرنے کے بعد پھر ہندو اورمسلم بنگالی اپنی فطرت پر لوٹ آئے۔"آگ کا دریا "کا کمال اس پر امن معاشرے میں دونوں اقوام کی ہم آہنگی دیکھتا ہے تو وہ سرل سے اظہار خیال کرتاہے:

"دراصل میری سائیکا لوجی اتنی خراب ہو گئی ہے میرے ذہن پر ہندو مسلم پر ابلم اس تکلیف دہ شدت سے مسلط ہیں کہ ان دونوں فرقوں کو کہیں پر سکون انداز میناکھٹے زندگی گزارتے دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔" (۲۴)
قرۃالعین حیدر کی تحریریں اسی مذہبی اور ثقافتی ہم آہنگی کا منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔ان کی تحریریں استعمار کی پیش کی گئی مقامی باشندونکی دیو مالائی تصاویر کو رد کر کے ان کا اصل پر امن چہرہ سامنے لاتی ہیں۔ وہ عصبیت پر مبنی شناختوں کو رد کر کے امن و آشتی کی آفاقی قدریں پیش کرتی ہیں۔ان کے کبیری کردار امن اور محبت کے پیغامبر ہیں۔

حواشی
۱۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت ، طبع چہارم (نیا ادارہ ، لاہور ۱۹۴۹) ص:۳۲
۲۔ جیمز کیرول کے اپنے الفاظ یہ ہیں :

"Typically imperial powers depend on the inability of oppressed local poulations to muster a unfiedresitance, and the most successful occupiers are skilled at exploiting the differences among the occupied, Certainly that was the story of the British empire's success, and its legacy of nurtured local hatreds can be seen wherever the union Jack flew, from Muslim-Hindu hatred inPakistan and India to Catholic-Protestant hatred in Ire Land , to, Yes Jew-Arab hatred in modern Israeel."

Constantine's Sword (The church and the Jews)

جیمز کیرول ،(ہاؤگٹن ، مفلین کمپنی ، بوسٹن نیو یارک ، ۲۰۰۲)
۳۔ میاں محمد شفیع ، ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی واقعات و حقائق(مکتبہ جمال ، لاہور ۲۰۰۸) ص:۲۸۴
۴۔ ایڈورڈ سعید کے مطابق لاسویل کی پراپیگنڈہ تھیوری یہ ہے:

"what counts, is not what people are or think but what they can be made into be and think، "

ایڈورڈسعید "Orientalism"، اشاعت پنجم (پینگوئن بکس لندن انگلینڈ ۲۰۰۳)ص: ۲۹۲
۵۔بہ حوالہ مصطفی علی بریلوی، سید، انگریزوں کی لسانی پالیسی۔(اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی،۱۹۷۰)،ص: ۸۳
۶۔ گریر سن جی ۔اے ، Linguistic survey of India (آفس آف دی سپرنٹنڈنٹ انڈیا ، کلکتہ ۱۹۰۳-۱۹۱۸) ۱۱ جلدیں
۷۔ مصطفی علی بریلوی ، سید ، انگریزوں کی لسانی پالیسی (اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ، کراچی ، ۱۹۷۰) ص: ۹۵
۸۔ سلیمان علی ندوی ، سید ، نقوش سلیمانی (مکتبہ مشرق آرام باغ ، کراچی ، ۱۹۵۱)ص:۴۸
۹۔ مصطفی علی بریلوی ، سید ، متذکرہ بالا ، ص : ۹۸
۱۰۔قرۃالعین حیدر،آگ کا دریا مشمولہ مجموعہ قرۃالعین حیدر(سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۹)ص:۱۱
۱۱۔ایضا۔ ص:۱۳۸
۱۲۔ایضا۔ ص:۱۴۸
۱۳۔ایضا۔ ص:۱۹۴
۱۴۔میرے بھی صنم خانے،متذکرہ بالا،ص:۹۱۹
۱۵۔سپی واک دانشورانہ علمی تشدد کی مثال یوں دیتی ہے:

"In the face of the possibility that the intellectual is implict in the persistent constitution of other as the seffs shadow a possibility of political practice for the intellectual would be to put

the economic under erasure to see the ecoomic factor as irreducbily as it reinscribesimperfactly when it claims to be the final determination or the transcendental signified ."

گائتری چکراورتی سپی واک،Can the Subaltern speak مشمولہ
(مرتبین کیری نیلسن،لارنس گراس برگ)Marxism and the interpretation of Culture (یونیورسٹی آف الینوسیاپریس۱۹۸۸)ص:۰ ۲۸
۱۶۔آگ کا دریا،متذکرہ بالا،ص:۱۴۸
۱۷۔ایضا،۔ ص:۱۳۸
۱۸۔ ایڈورڈ سعید، Orientalism اشاعت پنجم (پینگوئن بکس لندن انگلینڈ2003) ص :۲۱۰
۱۹۔آگ کا دریا،متذکرہ بالا،ص:۱۳۹
۲۰۔ ایضاََ ، ص : ۲۵۶
۲۱۔میرے بھی صنم خانے،متذکرہ بالا،ص:۹۲۸
۲۲۔ ایضاََ ، ص : ۹۳۸
۲۳۔آگ کا دریا،متذکرہ بالا،ص:۲۵۶
۲۴۔ ایضاََ ، ص : ۳۵۰